معظّم شیخ

اژدہا اور پانی

اور ان قیود کے اندر فریبِ ارض و سما
سیاہ شب کا سمندر
سفید دن کی ہوا

— منیر نیازی

— ایک —

اصل قصّہ یوں ہے کہ جب اسے اژدہے کے پھنکارنے کی آواز آئی تو اسے لگا کہ وہ پھر کوئی خواب دیکھ رہا ہے۔ مگر یہ کیسا بن کہانی اور بن جانے پہچانے شہروں والا خواب! صرف آواز اور وہ بھی اژدہے کی! اس کی نیند کا خول تو ٹوٹ چکا تھا لیکن وہ آنکھیں میچے اپنے میلے بستر میں لیٹا مری مری سی کروٹیں لیتا رہا، شاید اژدہے کے ڈر سے۔ ذرا سا اور جاگنے پر اس نے بڑی شدّت کے ساتھ گمشدہ خواب کا کوئی کنارا پکڑنے کی کوشش کی لیکن کچھ یاد نہ آسکا۔ پھر اس نے اژدہے کے نقش و نگار یاد کرنے پر ہی اکتفا کرنے کی سوچی مگر وہ بھی بے سود۔

یہ بات تو ٹھیک ہی ہے کہ اسے خواب عموماً یاد نہیں رہتے تھے، اور شاید اسی لیے وہ ایک بے نام سا خوف اپنے اندر سمیٹے پھرتا رہتا تھا۔ اس نے ساحل کی لہروں کی مانند ڈھلتی غنودگی میں محسوس کیا کہ اژدہے کے سانس لینے کی آواز اسے اب تک آرہی ہے۔ ساحل کی چٹانوں سے ٹکرانے کے شور سے ملتی جلتی آواز۔ ممکن ہو، اس نے سوچا، کہ وہ خواب میں ایک اور خواب دیکھ رہا ہو!

وہ آواز اب بھی آرہی تھی۔ اسے لگا جیسے وہ خوف کی چادر میں لپٹا پڑا ہے۔ اسے خوف اور سُستی کے امتزاج میں ایک میٹھا سا سکون محسوس ہوا۔ یہ جاننا اب مشکل ہے کہ کون سا خیال اسے پہلے آیا: کہ وہ کوئی خواب دیکھ ہی نہیں رہا تھا، یا کہ اژدہے ڈنک

نہیں مار سکتے۔ اسے اس خیال سے کچھ ڈر سا لگا۔ لیکن ساتھ ساتھ جیسے وہ خدا کا شکر گزار تھا۔ اگر اژدہے کی جگہ کہیں سانپ ہوتا تو وہ اپنا زہر کب کا اس کے بدن میں انڈیل یہ جا وہ جا ہو چکا ہوتا، اور وہ نیند ہی میں اگلے جہاں پہنچ چکا ہوتا۔ لیکن پھر خوف کی چادر جیسے اچانک وزنی ہو گئی ہو۔ یہ سوچتے ہوے کہ گھر میں اژدہا گھسا بیٹھا ہے اس کا سانس حلق میں اٹک سا گیا۔

حالانکہ وہ چھوٹی جسامت کا مالک تھا پھر بھی بلا کا پھرتیلا مشہور تھا۔ اپنے چہرے پر گہرے چیچک کے داغوں کو اس نے کسی قدر داڑھی کے نیچے چھپا لیا تھا۔ زندگی کی تلخیوں سے تنگ آکر اس نے ایک مسلسل تصوراتی پناہ گاہ تراش رکھی تھی جس کی کھوہ کے اندھیرے میں وہ اپنی آرزؤں کا فلمی عکس بُنتا رہتا تھا؛ کبھی اداکار ندیم کا روپ دھار کر تو کبھی جیتیندر بن کر کسی عمارت کی تیسری منزل سے چھلانگ لگا دیتا؛ کبھی ٹی وی والے رام کی شکل میں دوسری منزل میں ماسٹر رحمت درزی کی جوان بیٹی فاطمہ کو سیتا بنے دیکھتا اور اسے چھڑانے کے لیے لنکا تک چلا جاتا؛ آگ کے دائرے میں سے کود کود جاتا؛ تو کبھی شیر کا پیٹ ایک ہی وار میں چیر پھاڑ ڈالتا۔ تصورات کے محل کی سیر سے واپسی پر وہ جیسے ایک دھیمی مسکراہٹ سے کِھل اٹھتا، ویسے کچھ ہی ساعتوں کے بعد اس کے دل پر مردنی چھا جاتی۔

نہ جانے وہ غنودگی کے کس عالم میں تھا کہ مکمل جاگنے کے بجائے اژدہے کے زہریلے نہ ہونے کے خیال میں ڈوبتا چلا گیا۔ اس نے پہلے خود کو خوش قسمت سمجھا، پھر قابلِ رشک۔ خیالی پلاؤ کی دیگ میں پکتے ہوے دانے کی طرح اس نے بھی سوچا کہ وہ اپنے حملہ آور کی گرفت سے صرف آزاد ہی نہیں ہوجائے گا بلکہ اسے مقیّد بھی کر لے گا اور اس کے بعد وہ اس کا چمڑا سُکھا کر اس کے لانگ بوٹ، کمر کی پیٹیاں اور بٹوے تیار کر کے بیچے گا۔ اسے اس خیال سے دلاسہ ہوا کہ اس کی زندگی کی بھی کوئی منزل ہے۔

اچانک اسے دل میں اک ٹیس سی محسوس ہوئی۔ یا شاید یہ اس کے تلوے میں اٹھی تھی۔ کہیں یہ زہریلا اژدہا تو نہیں؟ اسے درد کا ایک شور سا سینے میں اٹھتا سنائی دیا۔ سانس اور سوچ کے درمیان اسے موت براجمان نظر آئی۔ پھر جب ہولے ہولے اس کی سانس چلنے لگی تو اسے لگا کہ اژدہے کے سانس لینے کی آواز میں پانی کے بہنے کا ہلکا سا شور بھی شامل ہے۔ گویا اس کی آنکھ نے خود ہی کُھل جانے کا فیصلہ کیا ہو۔ اسے کھڑکی کے اَدھ

کُھلے پٹ کے ساتھ تاریکی کے علاوہ کچھ نظر نہیں آیا۔ ایک لمحے کے لیے اپنے احساسِ تنہائی کے ساتھ اسے ڈر کی سڑی بو بھی آئی۔ ایک آنکھ کھلی دوسری بند، اسے یوں لگا جیسے اژدہا کمرے کے کھرے میں پڑے برتن سے پانی ہڑپ کر رہا ہے۔ یا پانی کی قے کر رہا ہے۔ تجسس خوف کو روند تا ہوا آگے بڑھا۔ اس کی دوسری آنکھ بھی تھوڑی سی کھلی۔ ارے کیا یہ سالا اژدہا پانی کا بنا ہوا ہے، جو فرش پر اپنا سر پٹخ رہا ہے؟ اس نے اپنی اَدھ کُھلی آنکھیں کوٹھڑی کے اندھیرے میں دوڑائیں، لیکن بِن بُلائے کا مہمان کہیں نظر نہ آیا۔ حالانکہ اب اس کی گرم سانس کی آواز ابلتے لاوے کا پتا دے رہی تھی۔ وہ اپنے ذہن کے خلا میں بھٹکتا رہا۔

جیسے اس کا دل رک گیا، خوشی کے جھٹکے سے۔ اسے یقین نہیں آیا۔ کہاں اژدہے کی سانس، اور وہ بھی خواب میں، اور کہاں حقیقت میں پانی کی آواز۔ یہ تو نَل کے پانی کا شور ہے! مگر اتنے سویرے؟ ابھی تو پو بھی نہیں پھٹی! اسے اس گھڑی اژدہے کا سرسری سا خیال آیا۔ مسکراتا ہوا وہ پھرتی سے چادر کو ایک طرف پھینک، بستر سے اچھلا، یہ سوچتے ہوے کہ سالا پانی بھی تو ڈنک نہیں مارتا۔

وہ کھرے میں پڑی ہوئی بالٹی کی طرف لپکا، اور جیسے ہی اس نے بالٹی کو اچکا، اس کا دھیان چھوٹے ڈول کی طرف گیا، اور اس نے اسے بھی لے لیا۔ ننگے پاؤں ہی کوٹھڑی سے نکل کر سیڑھیاں اترنے لگا۔ سیڑھیوں کے اندھیرے سے نکل کے جیسے ہی باہر کے اندھیرے میں داخل ہوا تو اسے لگا وہ خواب ہی میں جاگا ہوا ہے۔ لیکن پھر اسی دَم تلووں میں گیلی زمین کی ٹھنڈک شدت سے محسوس ہوئی تو حقیقت کا احساس واپس لوٹا۔

اسے دور سے کارپوریشن کا نل نظر آیا۔ اسے یاد آیا کہ یہاں ہر روز قطار در قطار، ایک دوسرے پر چڑھتے ہوے لوگ خالی برتنوں کے ساتھ اپنی باری کا انتظار کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ عورتیں اونچی اونچی آواز میں یا تو ہنس رہی ہیں یا پھر لڑ رہی ہیں۔ گندے منے بچّے پھسل رہے ہیں، گر رہے ہیں یا ماؤں کی ٹانگوں سے لپٹے بِلبلا رہے ہیں۔ کچھ مرد سوٹے لگا رہے ہیں، کچھ سیاست پر جھگڑ رہے ہیں، کچھ عورتوں کی لڑائی میں بیچ بچاؤ کر رہے ہیں۔ وہ دن میں کئی مرتبہ اس واقعے کو یاد کرتا جب ماسٹر رحمت درزی کی بیٹی تندور والی کی چھوٹی بہن سے گتھم گتھا ہو گئی تھی اور وہ اوروں کی طرح اسی نیّت سے آگے بڑھا تھا کہ اسے فاطمہ کے جسم کو چھونے کا اس سے بہترین موقع دوبارہ نہیں مل سکے گا۔ اس نے بظاہر بڑی معصومیت سے اپنا بایاں ہاتھ تندور والی کی بہن کے کندھے پر اور

دایاں ہاتھ فاطمہ کے کندھے پر رکھ کر دونوں کو پَرے دھکیلنا چاہا۔ اسی اثنا میں جب دوسرے لوگوں نے بھی ان نوجوان عورتوں کو ایک دوسرے سے پَرے کھینچا تو اس کا ہاتھ فاطمہ کے کندھے سے پھسل کر اس کی نوخیز چھاتی پر آگرا۔ جیسے سانپ نے ایک میٹھا زہر اُتار دیا تھا اس کی ہتھیلی میں۔ وہ بھی اچانک ٹھٹھک کر پیچھے ہٹ گئی تھی۔ اس واقعے کے بعد وہ رحمت درزی کے آنگن کے سامنے سے کئی مرتبہ گزرا تاکہ فاطمہ سے کسی بہانے آنکھ مٹکا لڑا سکے مگر فاطمہ نے اسے ذرا سی بھی گھاس نہ ڈالی۔ اس کی تنہائی کا کرب بڑھتا ہی رہا۔

آج سب سوئے ہوے ہیں، اسے خیال آیا، میں اکیلا ہی جاگا ہوا ہوں۔ ابھی رات کا سلسلہ باقی ہے اور پانی کس جوش سے بہے جا رہا ہے۔ وہ گھبرایا کہ پانی کی شرڑ شرڑ کہیں لوگوں کو جگا ہی نہ دے۔ میں صرف پانی بھرنے تھوڑے ہی جا رہا ہوں، اس نے سوچا، بلکہ حضور تو آج خوب صابن مَل مَل کر نہائیں گے۔ لگتا ہے کہ کسی بھنگی مادرچود نے رات کو نل کھلا چھوڑ دیا ہے، اور اب پانی ضائع ہورہا ہے۔ لیکن اس میں بھی تو خدا کی مصلحت ہی ہے۔ ...

لال بیری کے پیڑ سے کوئی چھ سات گز کے فاصلے پر پہنچ کر جوں ہی اس کا زاویۂ نظر ذرا بہتر ہوا تو اس منش نے بڑی شش و پنج سے دیکھا کہ پانی جس لے سے پلتا، بَل کھاتا نل کے منہ سے نکل رہا ہے بالکل راکھ کا بنا اژدہا لگتا ہے۔ اور تو اور پانی کا نچلا سرا جس طرح سیمنٹ کے کھرے سے سر پٹخ رہا تھا اور پھیل رہا تھا اسے اسی کا کھلا منہ لگا، جیسے آنے والے کا ہی انتظار کر رہا ہو بھڑوا۔ بیری کے نیچے سے گزرتے ہوے ایک انتہائی مختصر سے لمحے کے لیے اسے یوں گمان ہوا جیسے وہ کسی آسیب کے اثر سے گزر رہا ہے۔

— دو —

اس نے پلکیں جھپکیں، آنکھوں کو زور سے کئی بار مَلا، ایک دو بار اپنی کلائی پر چٹکی بھی کاٹی، اجی گردن کو بھی جھٹکا، مگر پانی کا نام و نشان تک نہیں ملا۔ دل کی تسلّی کی خاطر بالٹی کے اندر جھانک کر دیکھا تو وہ بھی خشک پیندے کا آئینہ ہی نظر آیا۔ اس نے احتیاط سے اپنے چاروں طرف گھوم کر دیکھا، سوچا کہ ہوسکتا ہے کہ کوئی تائی کا یار چھپا بیٹھا مذاق کر رہا ہو۔ یا شاید اوپر والا ہی آج مذاق پر تُلا بیٹھا ہے۔ اس نے بوکھلاہٹ

میں سوچا، پانی کا ایک بھی قطرہ کہیں نظر نہیں آرہا تھا اور نہ ہی اژدہے کی کھال کا کوئی ریشہ۔ یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے! کیا میں واقعی خواب میں ہوں؟ کیا ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ پانی تو بہہ رہا ہو صرف مجھے ہی نظر نہ آ رہا ہو؟ مگر پانی کی آواز تو آئے۔ کچھ ہی منٹوں میں اذان ہونے والی ہو گی، اس نے سوچا۔

اس کا دل بیٹھنے لگا۔ اس نے کھرے کو دیکھا۔ وہ بھی اسے خشک لگا۔ اسے پانی کی آواز یاد آئی جس نے اسے خواب سے بیدار کیا تھا۔ کیا وہ میرا وہم تھا؟ پانی اس کے اعصاب پر سوار تھا۔ شرمندگی اور افسردگی سے ہنستے ہوے اس نے بالآخر بالٹی اٹھا لی۔ ''آنسو بھری ہیں یہ جیون کی راہیں،'' اس نے مکیش کیآواز کو اپنے درد کی گہرائیوں میں سنا تو اسے کچھ سکون سا ملا۔ مگر اس نے ابھی بیری کی جڑوں کو پار ہی کیا تھا کہ اس کا دل دہل کر رہ گیا، جیسے کسی نے عجائب گھر کے سامنے والی توپ چلا دی ہو۔ وہ ٹھٹھک گیا۔ مڑ کے دیکھا تو کیا دیکھتا ہے کہ نل میں سے دھڑا دھڑ پانی چلا آرہا ہے۔ وہ بجلی کی سی تیزی سے واپس دوڑا۔ گرتے گرتے بچا، اور بالٹی اور ڈول ابھی اس کے ہاتھ ہی میں تھے کہ اس نے پانی کو غائب ہوتے ہوے محسوس کیا۔ اسے شدت سے اپنی پیاس کا احساس ہوا۔ اس کے کچھ پلّے نہ پڑا کہ آخر یہ ہو کیا رہا ہے۔ نل میں سے کچھ دیر خالی ہوا آتی رہی، پھر وہ بھی بند۔ اس کا چیخ مارنے کو جی چاہا، لیکن وہ صرف دانت پیستا رہ گیا۔ اس نے کچھ دیر کے لیے آنکھیں موند لیں اور پھر آہستہ آہستہ گننے لگا: ایک ... دو ... تین ... چار ...

وہ اکّیس پر رک گیا۔ پھر جیسے آہ بھرتے ہوے، او یزید کی اولاد آجا۔ کیوں ذلیل کیے جا رہا ہے!

اعترافِ شکست کے ساتھ اس نے کوٹھڑی کا رخ کیا۔ اسے پانی سے نفرت سی ہو چلی تھی۔ اسے خیال گزرا کہ وہ امام حسین کے قافلے کا ایک فرد ہے اور دشمنوں نے اس کا پانی روک رکھا ہے۔ اس نے سوچا صحرا کی گرمی سے اس کا بدن جھلس جائے گا لیکن اس سے پہلے ایک تیرِ عدو اس کے حلق میں پیوست ہوگا اور وہ ڈھیر ہو جائے گا۔ کیا میں سراب کا پیچھا کر رہا ہوں؟ یا پانی مجھ سے دور بھاگ رہا ہے؟ اور اگر ایک دن میرے اندر کا پانی بھی یونہی مجھ سے بِدک جائے تو؟ کیا مین خشکی کا جزیرہ بن کر رہ جاؤں‌گا؟ اگر اندر کا پانی اڑ گیا تو وہاں کی آگ کیسے بجھے گی؟ انسان کی انرونی آگ جو اژدہے کی پھنکار سے بھی زیادہ گرم اور ریگستان سے بھی زیادہ جھلسا دینے والی ہے۔ چلتے چلتے اسے اپنے ااندر آگ

کی زبانیں چاٹتی محسوس ہوئیں۔ کیا وہ فاطمہ کو دوبارہ دیکھے بغیر ہی راکھ ہو جائے گا؟ اسے لگا جیسے اژدہا اس کی سانس کی نالی میں گھسا پھنکار رہا ہے۔ سراپا آگ، اس کے اندر اس کی جلتی ہوئی روح پانی! پانی! پانی! پکار رہی ہے۔ پھر جیسے آگ بجھنے کا شور! سمندر کا پیٹ کسی نے جیسے اس کے عین اوپر چیر دیا ہو! لال بیری کے نیچے، ٹیڑھی میڑھی جڑوں پر سنبھلتے ہوے اس نے مڑ کر دیکھا کہ نل میں سے پانی کا اژدہا نکلا چلا آرہا ہے۔ اس کا دل ہوا میں معلق، شک کے دھاگے سے بندھا ہوا، ابھی کٹا اور ابھی گرا، سیدھا اژدہے کے منہ میں۔

اسے کچھ یاد نہیں کہ وہ وہاں دوڑ کر پہنچا یا دھیرے دھیرے چلتا ہوا۔ ہاں، اس نے ایک لمحے کے لیے یہ ضرور سوچا تھا کہ وہ اب بھی مڑ سکتا ہے لیکن تبھی اسے پاؤں میں پانی کی بیڑیاں چھنچھناتی سنائی دی تھیں۔ ایسا لگا کہ پانی بہت ہی غصّے سے آرہا ہے۔ وہ جیسے جیسے نل کے نزدیک ہوتا گیا، اس کا وہم حقیقت کے سانچے میں ڈھلتا گیا۔ اسے پانی میں سے ہڑپ ہڑپ کی آواز آنے لگی۔ جیسے ہی نل کے قریب پہنچا، بالٹی نیچے رکھنے سے پہلے، اسے اپنے اندر کچھ جنم لیتا ہوا محسوس ہوا۔ وہ بالٹی اور ڈول ہاتھ میں تھامے غور کرتا رہا کہ نل میں سے نکلتی ہوئی چیز کبھی پانی لگتی ہے تو کبھی اژدہا تو کبھی کچھ بھی نہیں۔

ــ ابتدا ــ

دیکھیے، وہ جو گہرے سنہرے رنگ کا پتھر کا بت دیکھ رہے ہیں نہ آپ، بیری کے اس پار، جی ہاں، وہ دراصل بت نہیں ہے بلکہ وہی قدیم، بد قسمت انسان ہے جو ما قبلِ تاریخ سے آج تک پانی اور اژدہے کی کشمکش میں جکڑا ہوا ہے۔ کچھ تجربہ کار لوگ بتاتے ہیں کہ اسی کو ہی بت بننا کہتے ہیں، لیکن ان کی مخالفت میں بستی کے کم تجربہ کار لوگوں کی سمجھ کے مطابق یہ انسان بال سے باریک موت اور زندگی کے درمیان فرق کی لکیر پر ایسا کھڑا ہے جیسے وہ خود ہی وہ لکیر ہو۔ لیکن یہاں کے بچوں کا متّفقہ یقین یہ ہے کہ درحقیقت موت اور زندگی اس بت کے سر پر اپنا توازن برقرار رکھنے میں مسلسل کوشاں ہیں۔ اصل قصہ یوں ہے کہ جب اسے اژدہے کے پھنکارنے کی آواز آئی تو ...

معظّم شیخ

اژدہا اور پانی

اور ان قیود کے اندر فریبِ ارض و سما
سیاہ شب کا سمندر
سفید دن کی ہوا
— منیر نیازی

— ایک —

اصل قصّہ یوں ہے کہ جب اسے اژدہے کے پھنکارنے کی آواز آئی تو اسے لگا کہ وہ پھر کوئی خواب دیکھ رہا ہے۔ مگر یہ کیسا بن کہانی اور بن جانے پہچانے شہروں والا خواب! صرف آواز اور وہ بھی اژدہے کی! اس کی نیند کا خول تو ٹوٹ چکا تھا لیکن وہ آنکھیں میچے اپنے میلے بستر میں لیٹا مری مری سی کروٹیں لیتا رہا، شاید اژدہے کے ڈر سے۔ ذرا سا اور جاگنے پر اس نے بڑی شدّت کے ساتھ گمشدہ خواب کا کوئی کنارا پکڑنے کی کوشش کی لیکن کچھ یاد نہ آسکا۔ پھر اس نے اژدہے کے نقش و نگار یاد کرنے پر ہی اکتفا کرنے کی سوچی مگر وہ بھی بے سود۔

یہ بات تو ٹھیک ہی ہے کہ اسے خواب عموماً یاد نہیں رہتے تھے، اور شاید اسی لیے وہ ایک بے نام سا خوف اپنے اندر سمیٹے پھرتا رہتا تھا۔ اس نے ساحل کی لہروں کی مانند

ڈھلتی غنودگی میں محسوس کیا کہ اژدہے کے سانس لینے کی آواز اسے اب تک آرہی ہے۔ ساحل کی چٹانوں سے ٹکرانے کے شور سے ملتی جلتی آواز۔ ممکن ہو، اس نے سوچا، کہ وہ خواب میں ایک اور خواب دیکھ رہا ہو!

وہ آواز اب بھی آرہی تھی۔ اسے لگا جیسے وہ خوف کی چادر میں لپٹا پڑا ہے۔ اسے خوف اور سُستی کے امتزاج میں ایک میٹھا سا سکون محسوس ہوا۔ یہ جاننا اب مشکل ہے کہ کون سا خیال اسے پہلے آیا: کہ وہ کوئی خواب دیکھ ہی نہیں رہا تھا، یا کہ اژدہے ڈنک نہیں مار سکتے۔ اسے اس خیال سے کچھ ڈر سا لگا۔ لیکن ساتھ ساتھ جیسے وہ خدا کا شکر گزار تھا۔ اگر اژدہے کی جگہ کہیں سانپ ہوتا تو وہ اپنا زہر کب کا اس کے بدن میں انڈیل یہ جا وہ جا ہو چکا ہوتا، اور وہ نیند ہی میں اگلے جہاں پہنچ چکا ہوتا۔ لیکن پھر خوف کی چادر جیسے اچانک وزنی ہو گئی ہو۔ یہ سوچتے ہوے کہ گھر میں اژدہا گھسا بیٹھا ہے اس کا سانس حلق میں اٹک سا گیا۔

حالانکہ وہ چھوٹی جسامت کا مالک تھا پھر بھی بلا کا پھرتیلا مشہور تھا۔ اپنے چہرے پر گہرے چیچک کے داغوں کو اس نے کسی قدر داڑھی کے نیچے چھپا لیا تھا۔ زندگی کی تلخیوں سے تنگ آکر اس نے ایک مسلسل تصوراتی پناہ گاہ تراش رکھی تھی جس کی کھوہ کے اندھیرے میں وہ اپنی آرزؤں کا فلمی عکس بُنتا رہتا تھا؛ کبھی اداکار ندیم کا روپ دھار کر تو کبھی جیتیندر بن کر کسی عمارت کی تیسری منزل سے چھلانگ لگا دیتا؛ کبھی ٹی وی والے رام کی شکل میں دوسری منزل میں ماسٹر رحمت درزی کی جوان بیٹی فاطمہ کو سیتا بنے دیکھتا اور اسے چھڑانے کے لیے لنکا تک چلا جاتا؛ آگ کے دائرے میں سے کود کود جاتا؛ تو کبھی شیر کا پیٹ ایک ہی وار میں چیر پھاڑ ڈالتا۔ تصورات کے محل کی سیر سے واپسی پر وہ جیسے ایک دھیمی مسکراہٹ سے کِھل اٹھتا، ویسے کچھ ہی ساعتوں کے بعد اس کے دل پر مردنی چھا جاتی۔

نہ جانے وہ غنودگی کے کس عالم میں تھا کہ مکمل جاگنے کے بجائے اژدہے کے زہریلے نہ ہونے کے خیال میں ڈوبتا چلا گیا۔ اس نے پہلے خود کو خوش قسمت سمجھا، پھر قابلِ رشک۔ خیالی پلاؤ کی دیگ میں پکتے ہوے دانے کی طرح اس نے بھی سوچا کہ وہ اپنے حملہ آور کی گرفت سے صرف آزاد ہی نہیں ہوجائے گا بلکہ اسے مقیّد بھی کر لے گا اور اس کے بعد وہ اس کا چمڑا سُکھا کر اس کے لانگ بوٹ، کمر کی پیٹیاں اور بٹوے تیار کر کے بیچے

گا۔ اسے اس خیال سے دلاسہ ہوا کہ اس کی زندگی کی بھی کوئی منزل ہے۔

اچانک اسے دل میں اک ٹیس سی محسوس ہوئی۔ یا شاید یہ اس کے تلوے میں اٹھی تھی۔ کہیں یہ زہریلا اژدہا تو نہیں؟ اسے درد کا ایک شور سا سینے میں اٹھتا سنائی دیا۔ سانس اور سوچ کے درمیان اسے موت براجمان نظر آئی۔ پھر جب ہولے ہولے اس کی سانس چلنے لگی تو اسے لگا کہ اژدہے کے سانس لینے کی آواز میں پانی کے بہنے کا ہلکا سا شور بھی شامل ہے۔ گویا اس کی آنکھ نے خود ہی کُھل جانے کا فیصلہ کیا ہو۔ اسے کھڑکی کے اَدھ کُھلے پٹ کے ساتھ تاریکی کے علاوہ کچھ نظر نہیں آیا۔ ایک لمحے کے لیے اپنے احساسِ تنہائی کے ساتھ اسے ڈر کی سڑی بو بھی آئی۔ ایک آنکھ کھلی دوسری بند، اسے یوں لگا جیسے اژدہا کمرے کے کھرے میں پڑے برتن سے پانی ہڑپ کر رہا ہے۔ یا پانی کی قے کر رہا ہے۔ تجسس خوف کو روند تا ہوا آگے بڑھا۔ اس کی دوسری آنکھ بھی تھوڑی سی کھلی۔ ارے کیا یہ سالا اژدہا پانی کا بنا ہوا ہے، جو فرش پر اپنا سر پٹخ رہا ہے؟ اس نے اپنی اَدھ کُھلی آنکھیں کوٹھڑی کے اندھیرے میں دوڑائیں، لیکن بِن بُلائے کا مہمان کہیں نظر نہ آیا۔ حالانکہ اب اس کی گرم سانس کی آواز ابلتے لاوے کا پتا دے رہی تھی۔ وہ اپنے ذہن کے خلا میں بھٹکتا رہا۔

جیسے اس کا دل رک گیا، خوشی کے جھٹکے سے۔ اسے یقین نہیں آیا۔ کہاں اژدہے کی سانس، اور وہ بھی خواب میں، اور کہاں حقیقت میں پانی کی آواز۔ یہ تو نَل کے پانی کا شور ہے! مگر اتنے سویرے؟ ابھی تو پو بھی نہیں پھٹی! اسے اس گھڑی اژدہے کا سرسری سا خیال آیا۔ مسکراتا ہوا وہ پھرتی سے چادر کو ایک طرف پھینک، بستر سے اچھلا، یہ سوچتے ہوے کہ سالا پانی بھی تو ڈنک نہیں مارتا۔

وہ کھرے میں پڑی ہوئی بالٹی کی طرف لپکا، اور جیسے ہی اس نے بالٹی کو اچکا، اس کا دھیان چھوٹے ڈول کی طرف گیا، اور اس نے اسے بھی لے لیا۔ ننگے پاؤں ہی کوٹھڑی سے نکل کر سیڑھیاں اترنے لگا۔ سیڑھیوں کے اندھیرے سے نکل کے جیسے ہی باہر کے اندھیرے میں داخل ہوا تو اسے لگا وہ خواب ہی میں جاگا ہوا ہے۔ لیکن پھر اسی دَم تلووں میں گیلی زمین کی ٹھنڈک شدت سے محسوس ہوئی تو حقیقت کا احساس واپس لوٹا۔

اسے دور سے کارپوریشن کا نل نظر آیا۔ اسے یاد آیا کہ یہاں ہر روز قطار در قطار، ایک دوسرے پر چڑھتے ہوے لوگ خالی برتنوں کے ساتھ اپنی باری کا انتظار کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ عورتیں اونچی اونچی آواز میں یا تو ہنس رہی ہیں یا پھر لڑ رہی ہیں۔ گندے مندے

بچّے پھسل رہے ہیں، گر رہے ہیں یا ماؤں کی ٹانگوں سے لپٹے بِلبلا رہے ہیں۔ کچھ مرد سوٹے لگا رہے ہیں، کچھ سیاست پر جھگڑ رہے ہیں، کچھ عورتوں کی لڑائی میں بیچ بچاؤ کر رہے ہیں۔ وہ دن میں کئی مرتبہ اس واقعے کو یاد کرتا جب ماسٹر رحمت درزی کی بیٹی تندور والی کی چھوٹی بہن سے گتھم گتھا ہو گئی تھی اور وہ اوروں کی طرح اسی نیّت سے آگے بڑھا تھا کہ اسے فاطمہ کے جسم کو چھونے کا اس سے بہترین موقع دوبارہ نہیں مل سکے گا۔ اس نے بظاہر بڑی معصومیت سے اپنا بایاں ہاتھ تندور والی کی بہن کے کندھے پر اور دایاں ہاتھ فاطمہ کے کندھے پر رکھ کر دونوں کو پَرے دھکیلنا چاہا۔ اسی اثنا میں جب دوسرے لوگوں نے بھی ان نوجوان عورتوں کو ایک دوسرے سے پَرے کھینچا تو اس کا ہاتھ فاطمہ کے کندھے سے پھسل کر اس کی نوخیز چھاتی پر آگرا۔ جیسے سانپ نے ایک میٹھا زہر اُتار دیا تھا اس کی ہتھیلی میں۔ وہ بھی اچانک ٹھٹھک کر پیچھے ہٹ گئی تھی۔ اس واقعے کے بعد وہ رحمت درزی کے آنگن کے سامنے سے کئی مرتبہ گزرا تاکہ فاطمہ سے کسی بہانے آنکھ مٹکا لڑا سکے مگر فاطمہ نے اسے ذرا سی بھی گھاس نہ ڈالی۔ اس کی تنہائی کا کرب بڑھتا ہی رہا۔

آج سب سوئے ہوے ہیں، اسے خیال آیا، میں اکیلا ہی جاگا ہوا ہوں۔ ابھی رات کا سلسلہ باقی ہے اور پانی کس جوش سے بہے جا رہا ہے۔ وہ گھبرایا کہ پانی کی شرڑ شرڑ کہیں لوگوں کو جگا ہی نہ دے۔ میں صرف پانی بھرنے تھوڑے ہی جا رہا ہوں، اس نے سوچا، بلکہ حضور تو آج خوب صابن مَل مَل کر نہائیں گے۔ لگتا ہے کہ کسی بھنگی مادرچود نے رات کو نل کھلا چھوڑ دیا ہے، اور اب پانی ضائع ہورہا ہے۔ لیکن اس میں بھی تو خدا کی مصلحت ہی ہے۔ ...

لال بیری کے پیڑ سے کوئی چھ سات گز کے فاصلے پر پہنچ کر جوں ہی اس کا زاویۂ نظر ذرا بہتر ہوا تو اس منش نے بڑی شش و پنج سے دیکھا کہ پانی جس لے سے ہلتا، بَل کھاتا نل کے منہ سے نکل رہا ہے بالکل راکھ کا بنا اژدہا لگتا ہے۔ اور تو اور پانی کا نچلا سرا جس طرح سیمنٹ کے کھرے سے سر پٹخ رہا تھا اور پھیل رہا تھا اسے اسی کا کھلا منہ لگا، جیسے آنے والے کا ہی انتظار کر رہا ہو بھڑوا۔ بیری کے نیچے سے گزرتے ہوے ایک انتہائی مختصر سے لمحے کے لیے اسے یوں گمان ہوا جیسے وہ کسی آسیب کے اثر سے گزر رہا ہے۔

— دو —

اس نے پلکیں جھپکیں، آنکھوں کو زور سے کئی بار مَلا، ایک دو بار اپنی کلائی پر چٹکی بھی کاٹی، اجی گردن کو بھی جھٹکا، مگر پانی کا نام و نشان تک نہیں ملا۔ دل کی تسلّی کی خاطر بالٹی کے اندر جھانک کر دیکھا تو وہ بھی خشک پیندے کا آئینہ ہی نظر آیا۔ اس نے احتیاط سے اپنے چاروں طرف گھوم کر دیکھا، سوچا کہ ہوسکتا ہے کہ کوئی تائی کا یار چھپا بیٹھا مذاق کر رہا ہو۔ یا شاید اوپر والا ہی آج مذاق پر تُلا بیٹھا ہے۔ اس نے بوکھلاہٹ میں سوچا، پانی کا ایک بھی قطرہ کہیں نظر نہیں آرہا تھا اور نہ ہی اژدہے کی کھال کا کوئی ریشہ۔ یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے! کیا میں واقعی خواب میں ہوں؟ کیا ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ پانی تو بہہ رہا ہو صرف مجھے ہی نظر نہ آ رہا ہو؟ مگر پانی کی آواز تو آئے۔ کچھ ہی منٹوں میں اذان ہونے والی ہو گی، اس نے سوچا۔

اس کا دل بیٹھنے لگا۔ اس نے کھرے کو دیکھا۔ وہ بھی اسے خشک لگا۔ اسے پانی کی آواز یاد آئی جس نے اسے خواب سے بیدار کیا تھا۔ کیا وہ میرا وہم تھا؟ پانی اس کے اعصاب پر سوار تھا۔ شرمندگی اور افسردگی سے ہنستے ہوے اس نے بالآخر بالٹی اٹھا لی۔ ''آنسو بھری ہیں یہ جیون کی راہیں،'' اس نے مکیش کیآواز کو اپنے درد کی گہرائیوں میں سنا تو اسے کچھ سکون سا ملا۔ مگر اس نے ابھی بیری کی جڑوں کو پار ہی کیا تھا کہ اس کا دل دہل کر رہ گیا، جیسے کسی نے عجائب گھر کے سامنے والی توپ چلا دی ہو۔ وہ ٹھٹھک گیا۔ مڑ کے دیکھا تو کیا دیکھتا ہے کہ نل میں سے دھڑا دھڑ پانی چلا آرہا ہے۔ وہ بجلی کی سی تیزی سے واپس دوڑا۔ گرتے گرتے بچا، اور بالٹی اور ڈول ابھی اس کے ہاتھ ہی میں تھے کہ اس نے پانی کو غائب ہوتے ہوے محسوس کیا۔ اسے شدت سے اپنی پیاس کا احساس ہوا۔ اس کے کچھ پلّے نہ پڑا کہ آخر یہ ہو کیا رہا ہے۔ نل میں سے کچھ دیر خالی ہوا آتی رہی، پھر وہ بھی بند۔ اس کا چیخ مارنے کو جی چاہا، لیکن وہ صرف دانت پیستا رہ گیا۔ اس نے کچھ دیر کے لیے آنکھیں موند لیں اور پھر آہستہ آہستہ گننے لگا: ایک ... دو ... تین ... چار ...

وہ اکّیس پر رک گیا۔ پھر جیسے آہ بھرتے ہوے، او یزید کی اولاد آجا۔ کیوں ذلیل کیے جا رہا ہے!

اعترافِ شکست کے ساتھ اس نے کوٹھڑی کا رخ کیا۔ اسے پانی سے نفرت سی ہو چلی تھی۔ اسے خیال گزرا کہ وہ امام حسین کے قافلے کا ایک فرد ہے اور دشمنوں نے اس کا پانی

روک رکھا ہے۔ اس نے سوچا صحرا کی گرمی سے اس کا بدن جھلس جائے گا لیکن اس سے پہلے ایک تیرِ عدو اس کے حلق میں پیوست ہوگا اور وہ ڈھیر ہو جائے گا۔ کیا میں سراب کا پیچھا کر رہا ہوں؟ یا پانی مجھ سے دور بھاگ رہا ہے؟ اور اگر ایک دن میرے اندر کا پانی بھی یونہی مجھ سے بِدک جائے تو؟ کیا مین خشکی کا جزیرہ بن کر رہ جاؤں‌گا؟ اگر اندر کا پانی اڑ گیا تو وہاں کی آگ کیسے بجھے گی؟ انسان کی انرونی آگ جو اژدہے کی پھنکار سے بھی زیادہ گرم اور ریگستان سے بھی زیادہ جھلسا دینے والی ہے۔ چلتے چلتے اسے اپنے ااندر آگ کی زبانیں چاٹتی محسوس ہوئیں۔ کیا وہ فاطمہ کو دوبارہ دیکھے بغیر ہی راکھ ہو جائے گا؟ اسے لگا جیسے اژدہا اس کی سانس کی نالی میں گھسا پھنکار رہا ہے۔ سراپا آگ، اس کے اندر اس کی جلتی ہوئی روح پانی! پانی! پانی! پکار رہی ہے۔ پھر جیسے آگ بجھنے کا شور! سمندر کا پیٹ کسی نے جیسے اس کے عین اوپر چیر دیا ہو! لال بیری کے نیچے، ٹیڑھی میڑھی جڑوں پر سنبھلتے ہوے اس نے مڑ کر دیکھا کہ نل میں سے پانی کا اژدہا نکلا چلا آرہا ہے۔ اس کا دل ہوا میں معلق، شک کے دھاگے سے بندھا ہوا، ابھی کٹا اور ابھی گرا، سیدھا اژدہے کے منہ میں۔

اسے کچھ یاد نہیں کہ وہ وہاں دوڑ کر پہنچا یا دھیرے دھیرے چلتا ہوا۔ ہاں، اس نے ایک لمحے کے لیے یہ ضرور سوچا تھا کہ وہ اب بھی مڑ سکتا ہے لیکن تبھی اسے پاؤں میں پانی کی بیڑیاں چھنچھناتی سنائی دی تھیں۔ ایسا لگا کہ پانی بہت ہی غصّے سے آرہا ہے۔ وہ جیسے جیسے نل کے نزدیک ہوتا گیا، اس کا وہم حقیقت کے سانچے میں ڈھلتا گیا۔ اسے پانی میں سے ہڑپ ہڑپ کی آواز آنے لگی۔ جیسے ہی نل کے قریب پہنچا، بالٹی نیچے رکھنے سے پہلے، اسے اپنے اندر کچھ جنم لیتا ہوا محسوس ہوا۔ وہ بالٹی اور ڈول ہاتھ میں تھامے غور کرتا رہا کہ نل میں سے نکلتی ہوئی چیز کبھی پانی لگتی ہے تو کبھی اژدہا تو کبھی کچھ بھی نہیں۔

ـــ ابتدا ـــ

دیکھیے، وہ جو گہرے سنہرے رنگ کا پتھر کا بت دیکھ رہے ہیں نہ آپ، بیری کے اس پار، جی ہاں، وہ دراصل بت نہیں ہے بلکہ وہی قدیم، بد قسمت انسان ہے جو ما قبلِ تاریخ سے آج تک پانی اور اژدہے کی کشمکش میں جکڑا ہوا ہے۔ کچھ تجربہ کار لوگ بتاتے ہیں کہ اسی کو

ہی بت بننا کہتے ہیں، لیکن ان کی مخالفت میں بستی کے کم تجربہ کار لوگوں کی سمجھ کے مطابق یہ انسان بال سے باریک موت اور زندگی کے درمیان فرق کی لکیر پر ایسا کھڑا ہے جیسے وہ خود ہی وہ لکیر ہو۔ لیکن یہاں کے بچوں کا متّفقہ یقین یہ ہے کہ درحقیقت موت اور زندگی اس بت کے سر پر اپنا توازن برقرار رکھنے میں مسلسل کوشاں ہیں۔ اصل قصہ یوں ہے کہ جب اسے اژدہے کے پھنکارنے کی آواز آئی تو …